صدائے بازگشت

یہ کالم ایک "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے"۔ اس کے تحت علمی، فکری، تنقیدی اور تجزیاتی مراسلات کو ترجیح دی جائے گی۔

رمضان میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال

مدیر محترم——————سلام مسنون

شعبان المعظم کا پہلا عشرہ چل رہا ہے۔ مدارس اسلامیہ میں سالانہ امتحان اپنے آخری مرحلے میں ہے، چند ہی دنوں کے بعد تعطیل کلاں ہو جائے گی اور طلبہ و اساتذہ دو مہینے کی طویل مدت کے لیے اپنے اپنے وطن کو روانہ ہو جائیں گے۔ رمضان المبارک کا "موسمِ بہاراں" بھی جلد ہی شروع ہونے والا ہے۔ رمضان کا مہینہ کیا آتا ہے، رحمت و برکت کے دروازے اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ کھل جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا رزق کشادہ فرما دیتا ہے۔ ہر جانب عجب چہل پہل ہوتی ہے۔ بوڑھے، بچے اور جوان سبھی سحر و افطار کا لطف اٹھاتے ہیں۔ اس گہما گہمی میں ہم سے شعوری یا غیر شعوری طور پر کچھ ایسی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں جن سے اجتناب حد درجہ ضروری ہے۔

ملک کے طول و عرض میں رمضان کے مہینے میں لوگوں کو سحری کے وقت بیدار کرنے کے لیے لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ہوتا ہے، مسلمانوں کو سحری کے لیے بیدار کرنا ایک مستحسن عمل ہے جس پر انشاء اللہ بڑا اجر مرتب ہوگا، لیکن ہماری بے توجہی سے اس عمل میں بڑی بے ترتیبی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے بارہا مشاہدہ کیا کہ اکثر قریات و قصبات میں رات کے دو ڈھائی بجے ہی سے بڑی تیز آواز میں لاؤڈ اسپیکر آن کر دیا جاتا ہے اور فجر کی اذان تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ہندوستان چوں کہ جمہوری ملک ہے، جہاں ہر مذہب کے لوگ بستے ہیں اور تقریباً ہر گاؤں اور ہر شہر میں بستے ہیں۔ ظاہر ہے مسلسل ایک مہینے تک روزانہ دو بجے سے ساڑھے چار بجے تک شور و ہنگامہ ان کی نیند میں خلل کا باعث ہوگا۔ ایسے میں ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنے کسی بھی غیر ضروری عمل کے ذریعہ اپنے برادرانِ وطن کو تکلیف پہنچانے سے احتراز کریں اور اپنے عمل و کردار سے انھیں یہ پیغام دیں کہ اسلام امن و امان اور "جیو اور جینے دو" کا مذہب ہے۔ اسلام پڑوسیوں کے حقوق کا اس قدر لحاظ کرتا ہے کہ ان کے آرام و آسائش میں خلل کو بھی ناپسندیدہ عمل سمجھتا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ رمضان کے مہینے میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال بالکلیہ بند کر دیا جائے بلکہ میرا منشا صرف یہ ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال حسب ضرورت ہی ہونا چاہیے۔ اب حالات بہت بدل چکے ہیں، مرغ کی بانگ سن کر سحری ختم کرنے کا زمانہ گزر گیا۔ اب وقت کی تعیین کے لیے ہر گھر میں جدید آلات موجود ہیں، سوتوں کو جگانے کے لیے بھی طرح طرح کی صورتیں نکل آئی ہیں، اس کے باوجود مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے وقفے وقفے سے وقت کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن تیز آواز میں مسلسل گھنٹوں کیسٹیں بجانا ایک غیر ضروری عمل ہے اور اپنے غیر مسلم بھائیوں کے دلوں میں اپنے تئیں نفرت پیدا کرنے کا ذریعہ بھی۔ میری ناقص رائے کے مطابق اس سے اجتناب ہونا چاہیے۔ فقط۔ والسلام

محمد ساجد رضا مصباحی۔ جامعہ صمدیہ، پھپھوند شریف

ویران جزیروں میں ایک خوش رنگ

مکرمی جناب——————سلام مسنون

گردشِ لیل و نہار ہمیں وہاں لے آئی ہے جہاں اردو زبان سے ہمارے اسلاف کی کسی پرانی، پرشکوہ اور عالی شان حویلی کی طرح محبت تو بہت کرتے ہیں، مگر اس کی دیکھ بھال سے ہمیں کوئی دل چسپی نہیں یا یوں کہیے کہ اس کی حفاظت کی جیسے ہمیں کوئی ضرورت ہی نہیں۔ اس حویلی میں سحر و شام ایک چراغ جلانے کی روایت بھی ہم بھول گئے۔ ہماری اردو سے محبت ایک ایسا گلاس ہے جو خالی ہے، جس میں نہ شغف کا پانی ہے نہ عشق کی شراب اور نہ جنون کا زہراب۔ اردو سے عشق کیا ہوتا ہے اس کی مثال کچھ اس طرح ہو سکتی ہے کہ بابائے اردو مولوی عبد الحق نے اس زبانِ صد رنگ کی زلفِ گرہ گیر کی اسیری میں تا عمر شادی نہیں کی۔ لفظ لفظ سنوارتے رہے اور لغت ترتیب دیتے رہے۔ اورنگ آباد سے حیدرآباد اور ڈھاکہ سے کراچی تک کا دیوانہ وار سفر کرتے رہے۔ محبت کرنا آسان ہے مگر محبت کے تقاضوں کو پورا کرنا مشکل ہے۔ بقول غالب ؎

نہ پوچھ وسعتِ مے خانۂ جنوں غالبؔ
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

اردو کے لیے شور و غوغا اور داد و تحسین سے بہت زیادہ ضروری اردو والوں کی سنجیدگی ہے۔ اردو کے لیے ٹھوس اقدامات اور روشن لائحۂ عمل بنانے کا وقت آ چکا ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم بہت جذباتی ہیں، شور و غوغا کو ہم کارکردگی سمجھتے ہیں۔ کوئی اردو کی محبت میں ایک اچھا جملہ یا شعر کہہ دے تو ہم وفورِ شوق سے بے قابو ہو جاتے ہیں، مگر اردو کی مفلوک الحالی پر ہماری آنکھ نم نہیں ہوتی، دل میں اردو کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ بیدار نہیں ہوتا۔ اسے ہماری خوش فہمی ہی کہیے کہ ہمارے خیال میں چند

خوش الحان متشاعر اور مقرر شاعروں کی مدد سے ہم اردو کے مصائب کا بحر بے کراں پار کر لیں گے۔ یہاں شاید مجھے یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ مشاعروں کو سیاست دانوں نے اغوا کر لیا ہے اور اپنی امارت اور اقتدار کے ذریعہ اس کا استعمال اور استحصال کر رہے ہیں، اسی لیے ہمارے مشاعروں میں بھی ادبیت کا فقدان ہے۔ جب خواجہ میر درد نے باقاعدہ مشاعروں کی بنیاد رکھی تھی اس وقت مشاعرے تہذیبی درس گاہ تھے۔ آج نہ تو تہذیب باقی رہ گئی ہے نہ ہی اسے درس گاہ کی حیثیت حاصل ہے۔

ہمارے صوفیا و مشائخ نے اردو مشاعروں کا استعمال آدابِ مجلس اور تہذیب زندگی سکھانے کے لیے کیا۔ اس لیے اردو مہذب اور باوقار ہوئی تھی۔ آج چند سیاسی، سماجی اور معاشرتی مفادات کے لیے اردو کا جو استعمال ہو رہا ہے وہ ناشائستہ بھی ہے، ناپسندیدہ بھی اور زبان و ادب کے حق میں نقصان دہ تو ہے ہی یہ الگ بات کہ نامساعد حالات میں بھی اردو ایک بین الاقوامی زبان ہے اور دنیا کے گوشے گوشے میں اردو کی نئی بستیاں قائم ہو رہی ہیں، جو ویران جزیرے میں ایک خوش رنگ پرندے جیسی معلوم ہوتی ہیں۔

اردو کے تعلق سے جو دوہرا معیار اہل اردو نے اختیار کر رکھا ہے، زبان و ادب کے نقصان کی اصل اور بنیادی وجہ وہی ہے۔ نئی نسل کو اردو عزیز نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے، لیکن معاشرے میں اردو کے تعلق سے بے گانگی، احساس کم تری، اس کے روزگار سے جڑے نہ ہونے کا احساس اور ایسے ہی دیگر مفروضات کی وجہ سے آج کے نوجوانوں میں اردو سے رغبت کے باوجود ایک خوف سا پایا جاتا ہے کہ اگر ہم نے اردو پڑھی یا ہماری مارکس شیٹ پر اردو لکھا ہوا دکھائی دیا تو ہماری وقعت کم ہو جائے گی، یا حصولِ روزگار میں ہمیں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں اپنی تدریسی زندگی میں نوجوانوں کو بہت قریب سے دیکھ رہی ہوں اور میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ انھیں اپنی زبان سے محبت ہے، لیکن وہ ڈر جس کا ذکر میں نے کیا وہ انھیں روکتا ہے اردو کی جانب بڑھنے سے، ورنہ وہ چاہے اردو کی کلاسوں میں حاضری کا معاملہ ہو یا اردو کے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کا جذبہ۔ وہ کسی بھی شعبے میں پیچھے نہیں ہیں، لیکن وہ قاتل احساس کہ مسابقت کی دوڑ میں اردو ہمیں پیچھے کر دے گی، ان کے ذہنوں پر کچھ اس طرح نقش ہے کہ جب تک اسے نکالا نہیں جائے گا، نئی نسل اردو کے قریب نہیں آئے گی۔ یہ ہے ایک بات۔ دوسری بات جس کی نشان دہی ضروری معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ اب کالجوں میں جو طلبہ آرہے ہیں، وہ زبان کے اس معیار کے ساتھ نہیں آرہے ہیں جو ہمارے یا ہم سے پہلے کے زمانے میں دیکھا جاتا تھا۔ آج کے طلبہ کا نہ تو املا درست ہے نہ تلفظ۔ وہ شعر بھی سلیقے سے نہیں پڑھ سکتے۔

ہم اپنے طلبہ کو یہی سمجھاتے ہیں کہ اردو کا مقام کیا ہے، تاکہ ان میں جو احساس جاگزیں ہو چکا ہے اسے نکالا جا سکے۔ میں نے اکثر اپنے طلبہ سے کہا ہے کہ انگریزی کے مقابلے میں اردو والوں کے پاس کم تری کا احساس ہے تو سن لیجیے کہ اردو کے مشہور نقاد گوپی چند نارنگ کیا کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ: ”اردو دنیا کی زبانوں کا تاج محل ہے۔“ اردو کی شیرینی اور شگفتہ بیانی نے دنیا کو متاثر اور مرعوب کیا ہے۔ ملکہ وکٹوریا نے اپنے خانساماں عبدالکریم آگرہ والے سے اردو شاعری سیکھی تھی۔

سچ پوچھیے تو اردو کے تئیں ہمیں فخر بھی محسوس کرنا چاہیے اور شرم بھی۔ فخر اس لیے کہ اس زبان کا جادو ہر کس و ناکس کے سر چڑھ کر بولتا ہے، شرم اس لیے کہ بین الاقوامی زبان انگریزی کے مقابلے میں اردو کے اخبارات و رسائل بہت کم تعداد میں چھپتے ہیں۔ ہماری اس تساہلی اور بے حسی نے اردو کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ عام اردو والوں کے پاس اردو کتابوں کا تصور چھوڑیے ہمارے شعرا اور ادبا کے پاس بھی اردو کتابوں کا ذخیرہ مفقود ہے۔ کس کس بات کا رونا روئیں۔ ہماری اردو لائبریری کی کرسیاں بیٹھنے والوں کے انتظار میں بوڑھی ہو چکی ہیں۔ ہماری لائبریریوں کی کتابوں پر اتنی دھول اٹ چکی ہے کہ مطالعہ سے زیادہ وقت اسے صاف کرنے میں لگے گا۔ یہ ہمارا المیہ ہے، یہ ہمارا دکھ ہے۔ مگر اب مرثیہ خوانی اور نوحہ خوانی سے کام نہیں چلے گا بلکہ اردو کے محبت کے چراغ کو قریہ قریہ، کوچہ کوچہ اور شہر شہر روشن کرنے کے لیے اردو اکابرین اور مقتدرین بالخصوص مدرسین کو سنجیدہ اور مخلصانہ جدوجہد کرنی پڑے گی۔ بقول شاعر مشرق ؎

گیسوے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزیِ پروانہ ہے

مولانا حالی، سرسید احمد خان اور کرنل ہالبرائڈ کی کاوشات نے تو اردو ادب برائے ادب کو برائے زندگی کے تمغات سے ضرور سرفراز کیا۔ مگر وقت کی کروٹیں، تیز رفتار زندگی اور ضرورتوں کے پہاڑ نے اسے ”ادب برائے روپیہ“ بنا دیا۔ شعری، نثری، تنقیدی اور صحافتی تمام سطحوں پر ادب کا اولین مقصد روپیہ بن چکا ہے۔ یہ بھی برا نہ سمجھا جاتا اگر ادبی حوالوں سے ہماری روحانی سرشاریت و شادابیت نہ چھن چکی ہوتی اور وقت کے سفاک جنگل میں ضرورت صیاد اور زبان و ادب صید نہ بن چکے ہوتے۔ پنجۂ سیم و زر میں ادب ایک مَمولے کی طرح پھڑ پھڑا رہا ہے۔ حرص کے سیلاب میں ادبی دیانت داری خس و خاشاک کی طرح بہہ رہی ہے۔ ہوس کی آگ میں ادب عالیہ کے کھلیان جل رہے ہیں۔ وہی لفظ لکھے جا رہے ہیں جو اقتدار پسند کرتا ہے، وہی تحریریں لکھی جا رہی ہیں جو ظل الٰہی کو مرغوب ہیں، وہی موضوعات قلم بند ہو رہے ہیں جن کی بازارِ

وقت میں قیمت ہے۔ نقد ونظر کے نام پر قصیدہ خوانوں کے سنہرے اوراق فروخت ہو رہے ہیں۔ نوٹوں کے بنڈلوں کے عوض ادبی شناخت کی تزئین و تدوین ہو رہی ہے۔ مشاعروں کے لیے غزلوں کی منڈیوں کے شو کیس سجے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ ادب کے بازار میں ابن الوقتوں کا بول بالا ہے اور مقدس لوح وقلم کی آبروریزی ناقابلِ بیان ہوتی جارہی ہے۔ اس صورتِ حال کو محسوس کیجیے تو بار بار غالب یاد آتے ہیں۔

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہر آرزو
توڑا جو تونے آئینہ تمثال دار تھا

اس پرستم بالائے ستم الیکٹرونک میڈیا کا ہنگامہ اور دھوم دھڑاکا۔ اس طلسم کدے کے سحر نے معاشرے کے ہر چھوٹے بڑے ذہن کو مسحور کر دیا ہے۔ نہ گھریلو مجلسیں ہیں نہ ادبی محفلیں۔ نانی اماں کی کہانی سننے والا کوئی نہیں ہے۔ ماہِ کامل کی سوت کاتتی بڑھیا کو دیکھنے والا کوئی نہیں فرد کا فرد سے رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ ہر شخص الیکٹرونک میڈیا کے سحر کا گرفتار ہے۔ اس جادونگری میں کتابیں چھونے کی کسے فرصت۔ یہی وجہ ہے کہ کتابیں کسی بیوہ کی طرح محرومیوں کی دھول چاٹ رہی ہیں اور ادب کا طائرِ خوش نوا بے حسی کی فضاؤں میں کھوتا جارہا ہے۔

شاید ہمیں اندازہ نہ ہو کہ الیکٹرونک میڈیا کی جادوگری اور شعبدے بازی سے سب سے بڑا نقصان ہمارے نئ ذہنوں کا ہونے والا ہے۔ اس جادوگری کے پٹارے کی کرشمہ سازیاں اور معجز نمائیاں ہمارے نئے اذہان کو ایسی تساہلی اور سستی شکار بنارہی ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ ہماری نئ نسل تخیل کی بلند پروازی، رفتارِ خیال اور جہاں تصور سے محروم ہو جائے گی اور پھر کاغذ پر اندھیروں کا وہ سیلاب آئے گا جس کا تصور آج ناممکن ہے۔ ایسا لگتا ہے الیکٹرانک میڈیا ک قزاق دنیا کی ہر زبان کے ادب کا خزانہ لوٹ لیں گے۔ چناں چہ یہ ہماری تہذیبی ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے ادب اور زبان کی حفاظت اور تشکیل وتعمیر کے نئے وسائل کی تلاش میں پوری دیانت داری اور اخلاص کے ساتھ سرگرم ہو جائیں گے کہ اس کے علاوہ بچاؤ کا کوئی اور رستہ نہیں ہے۔ فقط

پروفیسر عائشہ سمن

پڑھ کے محزوں ہوئے ہم شہر خموشاں کے چراغ

لائق صد احترام حضرت مولانا مبارک حسین صاحب چیف ایڈیٹر ماہ نامہ اشرفیہ مبارک پور

سلام مسنون

خدا کا شکر ہے کہ خیریت سے ہوں، خدا کرے آپ ہمہ وجوہ بخیر وعافیت ہوں گے، آپ کی لکھی ہوئی معرکہ آرا معلوماتی کتاب ''شہر خموشاں کے چراغ'' پڑھی۔ بہت احتیاط اور بڑی گرم جوشی کے ساتھ آپ نے یہ کتاب لکھی ہے۔ ماہ نامہ اشرفیہ کے اداریوں میں جو کچھ آپ نے موقع موقع سے لکھا تھا ان سب کو جمع کر دینے سے اب ایک کتابی شکل میں وہ سب محفوظ ہو گئے اور قاری بھی پڑھ کر ان بزرگوں کی حیات کے واقعاتی اور جماعتی سرگرمیوں کے علاوہ ان کے بارے میں نئے سرے سے یہ بھی جان لیتے ہیں کہ وہ ملت کا اپنے دلوں میں کتنا درد رکھتے تھے اور ملی، ثقافتی اور مذہبی و مسلکی جذبات کے ساتھ ساتھ سیاسی اور معاشرتی سوجھ بوجھ بھی کتنا ذمہ دارانہ رکھتے تھے۔ آتش پرسوز کی جلن ان کے سینوں میں تھی، پڑھ کر آنکھوں میں آنسو بھی آئے اور طبیعت ان کے تعلق سے بڑی نم دیدہ ہو گئی۔

پڑھ کے محزوں ہوئے ہم شہر خموشاں کے چراغ
دے گئے درد و الم شہر خموشاں کے چراغ
خامہ فرسائیاں ملت میں بہت ہوتی ہیں
یہ عجب شے ہے رقم شہر خموشاں کے چراغ
کیا تھے وہ بھی کبھی مولانا مبارک صاحب
جن کو اب کہتے ہیں ہم شہر خموشاں کے چراغ
شانِ حق، شانِ خودی، شانِ تمنائے ارم
جلوۂ شانِ کرم شہرِ خموشاں کے چراغ
فکر کے لعل بدخشاں تھے کبھی دنیا میں
وہ جو تھے اہل قلم شہر خموشاں کے چراغ
واعظِ سادہ بھی تھے شعلہ نوا بھی تھے وہ
رکھتے تھے جاہ و حشم شہر خموشاں کے چراغ
سوے طیبہ کے لیے دل میں للک رکھتے تھے
چومتے نقشِ قدم شہر خموشاں کے چراغ
آج بھی الفتِ طیبہ کی ضیاؤں کے طفیل
لَو نہیں رکھتے مدھم شہر خموشاں کے چراغ
گلشن زیست کی تنہائیوں میں اے نازاںؔ
پڑھتے اکثر ہیں یہ ہم شہر خموشاں کے چراغ

آپ نے دیکھا، قاری آپ کی کتاب ''شہر خموشاں کے چراغ پڑھ کر اپنے سینوں میں کیسے کیسے جذبات کے چراغ رکھتے ہیں۔ یہ وقت کی ایک اہم ضرورت تھی جس کو آپ نے پورا کیا ہے۔ کن کن بزرگوں کا ذکر کیا جائے سبھی تو اپنی جماعت کے آفتاب وماہ تاب۔ ایک زمانے میں، ایک وقت میں تھے۔ ان حضرات کا مذہبی و مسلکی مساعی میں طوطی بولتا تھا، مناظرہ کہیے، تحریر و تقریر کا میدان کہیے یا ذکر واذکار کی ادبی مجلسیں ہر جگہ آج بھی ان کے نقوش رُلاتے ہیں۔ ذکر چھیڑیے تو آنکھوں سے ساون بھادوں لگ جاتا ہے، قوس و قزح نمودار ہو جاتی ہے۔ آخری بات وہی ہے کہ۔

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

فقط

نازاں فیضی گیاوی، عارف نگرم گیوال بگھہ، گیا، بہار